رسائل و مسائل

تعدد ازواج پر پابندی

سوال نمبر ۱: میں آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر اسلامی ریاست میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو تو کیا حکومت اس بنا پر تعدد ازواج پر پابندی عائد کر سکتی ہے؟

اس سوال کی ضرورت مجھے اس لیے محسوس کی ہے کہ میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں تعدد ازواج کی اجازت دی ہے وہاں ہنگامی صورت حال پیش نظر تھی۔ اس زمانے میں سالہا سال کے مسلسل جہاد کے بعد بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں اور بچے بے آسرا اور یتیم رہ گئے تھے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے یہ اجازت دی گئی تھی، تاکہ بیواؤں اور یتیم بچوں کو سوسائٹی میں جذب کیا جا سکے اور ان کی کفالت کی شائستہ صورت پیدا ہو سکے۔

جواب: آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے اتنا کم ہونا کہ اس سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو جائے ایک شاذ و نادر واقعہ ہے۔ عموماً تعداد مردوں ہی کی کم ہوتی رہتی ہے عورتوں کی تعداد کم ہونے کے وجوہ وہ نہیں ہیں جو مردوں کی تعداد کم ہونے کے ہیں۔ عورتیں اگر کم ہوں گی تو اس وجہ سے کہ صنف اناث کی پیدائش ہی صنف ذکور سے کم ہو۔ اور ایسا ہونا اول تو شاذ و نادر ہے۔ اور اگر ہو بھی تو عورتوں کی اتنی کم پیدائش نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو اور اسے حل کرنے کے لیے قوانین کی ضرورت پیش آئے۔ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی شادی کے رواج سے یہ مسئلہ خود ہی حل ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جو آپ نے لکھی ہے وہ قرآن کے صحیح مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کے کسی دور میں بھی تعدد ازواج ممنوع نہ تھا اور کوئی خاص وقت ایسا نہیں آیا کہ اس ممانعت کو کسی مصلحت کی بنا پر رفع کر کے یہ فعل جائز کیا گیا ہو۔ دراصل تعدد ازواج ہر زمانے میں تمام انبیاء کی شریعتوں میں جائز رہا ہے اور عرب جاہلیت کی سوسائٹی

میں بھی یہ جائز اور رائج تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صحابۂ کرام بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر عامل تھے۔ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ اس آیت کے نزول سے پہلے تعدد ازواج ناجائز تھا اور اس آیت نے آکر اسے جائز کیا۔ آپ کے علم میں ایسی کوئی آیت ہو تو اس کا حوالہ دیں۔

سوال نمبر ۲:۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ کے جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ میری گزارش صرف اتنی تھی کہ اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو جائے، تو کیا اس صورت میں حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی عائد کر سکے؟ آپ نے فرمایا ہے کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرا سوال بھی اسی شاذ صورت حال سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت پاکستان میں (مردم شماری کی رُو سے) عورتیں مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ اب کیا حکومت کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ جب تک یہ صورت حال قائم رہے، ایک سے زیادہ شادیوں کی ممانعت ہو جائے؟

میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تعدد ازواج کی اجازت کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اس زمانے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت حق میں مصروف تھے، تو سالہاسال کے جہاد کی وجہ سے بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا مسئلہ حل کرنا پڑا اور اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دے دی جائے۔ جس مقام پر یہ اجازت دی گئی ہے، اس سے قبل جہاد و قتال ہی کا ذکر آیا ہے۔ اس طرح میں نے (غلط یا صحیح) یہ استنباط کیا ہے کہ یہ اجازت مخصوص حالات کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ استنباط غلط بھی ہے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن کے صحیح مطالعہ پر مبنی نہیں تو اس سے ہٹ کر بھی یہی کچھ سوچا جا سکتا ہے کہ دو دو، تین تین اور چار چار نکاح اسی صورت میں کیے جا سکتے ہیں، جبکہ معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ اگر ان کی تعداد مقابلتہً زیادہ نہ ہو، یا مردوں کے مساوی ہو، تو اس جواز سے فائدہ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: پاکستان کی مردم شماری میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے کم پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہمارے ہاں فی الواقع عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے۔ بلکہ اس میں ہمارے ہاں کے رسم و رواج کا بڑا دخل ہے جس کی بنا پر لوگ اپنے ہاں کی عورتوں کا اندراج کرانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ تاہم اگر کروڑوں کی آبادی میں چند لاکھ کا فرق ہو بھی تو اس سے کوئی ایسا معاشرتی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا جس کے لیے تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے نکاح ثانی سے حل ہو جاتا ہے اور بالفرض اگر کوئی بہت ہی غیر معمولی کمی واقع ہو جائے تو عارضی طور پر کچھ مدت کے لیے پابندی عائد کرنا بھی جائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس پابندی کا اصل محرک یہی مسئلہ ہو۔ لیکن اس بات کو آخر چھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت دراصل اس بنا پر محسوس نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کا اصل محرک یہ مغربی تخیل ہے کہ تعدد ازدواج بجائے خود ایک برائی ہے اور از روئے قانون یک زوجی ہی کو رواج دینا مطلوب ہے۔ یہ محرک ہمارے نزدیک سخت قابل اعتراض ہے اور اس کی جڑ کاٹنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کوئی آیت تعدد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی ہے۔ تعدد ازدواج پہلے سے جائز چلا آ رہا تھا اور سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے نزول سے پہلے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تین ازواج مطہرات موجود تھیں۔ نیز صحابۂ کرام میں بھی بہت سے اصحاب تھے جن کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ سورۂ نساء کی مذکورہ آیت اس جائز فعل کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اس غرض کے لیے آئی تھی کہ جنگ احد میں بہت سے صحابہ کے شہید ہو جانے اور بہت سے بچوں کے یتیم ہو جانے سے فوری طور پر جو معاشرتی مسئلہ پیدا ہوا تھا اسے حل کرنے کی صورت مسلمانوں کو یہ بتائی گئی کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر کے ان یتیموں کو اپنی سرپرستی میں لے لو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعدد ازدواج صرف ایسے ہی مسائل پیش آنے کی صورت میں جائز ہے۔ آخر تیرہ چودہ سو برس سے ہمارے معاشرے میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اس سے پہلے کب یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ تعدد ازدواج کی اجازت مخصوص حالات کے ساتھ مشروط ہے؟ یہ طرز فکر تو ہمارے ہاں مغرب کے غلبہ سے پیدا ہوا ہے۔

زکوٰۃ و صدقات کا نظام

سوال :- انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ سے متعلق بعض سوالات کا جواب آپ سے مطلوب ہے۔ قرآن کہتا ہے : یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو ط (لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے بچ رہے)

اس پر دو سوال اُٹھتے ہیں :-

(۱) ضرورت کی کیا حدود ہیں، ہر شخص اپنی ضروریات کا ایک مختلف تصور رکھتا ہے۔ کسی کی ضرورت کے دائرہ میں صرف قوت لایموت آتا ہے، کسی کے ہاں آسائشات اور کسی کے تعیشات۔ پھر اس حکم کا مطلب بادِ عا کیا ہو سکتا ہے کہ ضرورت کے دائرہ یا اس مقدار کے بعد جو بچے وہ خدا کی راہ میں خرچ کرو۔

(۲) اگر خدا کی راہ میں تمام بچت خرچ کر دی تو سرمایہ کاری (INVESTMENT) کیسے ہوگی۔ اس طرح تو سرمایہ ہی نہ ہوگا اور ایک عامل پیدائش ختم ہو جائے گا۔ ملکی معیشت تباہ ہو جائے گی۔

اس کے بعد ایک دو سوالات زکوٰۃ کے بارے میں ہیں۔ ہمارے پروفیسر صاحب نے زکوٰۃ کا تنقیدی تجزیہ کیا تو مندرجہ ذیل دو نکتے بیان کیے جو درحقیقت اعتراض ہیں۔ از راہِ کرم ان کا بھی جواب دیں۔

پہلا یہ کہ زکوٰۃ متناسب ٹیکس (PROPORTIONAL TAX) ہے متزائد ٹیکس (PROGRESSIVE TEX) نہیں۔ یعنی شروع میں جہاں سے زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اس سے لے کر ارب پتی تک شرح ایک ہی رہتی ہے۔ اس طرح کم مالدار لوگوں پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ۲½ روپے کی قدر زیادہ مالداروں کی بہ نسبت کم مالدار لوگوں کے نزدیک زیادہ ہے۔ اس طرح یہ ناانصافی ہے جو کہ اسلامی معیشت میں روا رکھی جاتی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ اس مال پر فرض ہوتی ہے جو کہ سال کے دوران میں ضرورت سے بچ رہے اور جمع ہو گیا ہو۔ لیکن اگر ایک آدمی بے دردی سے (LAVISHLY) خرچ کر کے کچھ بھی نہیں بچاتا تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

جواب :۔ آپ کے سوالات کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں :۔

یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو ؕ میں اسلام کے نظامِ معاشی کا ایک ابتدائی اور بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جائز کمائی پر حقِ ملکیت حاصل ہے۔ اس سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ شخصی ملکیت سے بالکل دستبردار ہو جائے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اپنی املاک میں تصرف کرے۔ قانوناً اور اخلاقاً اس سے جس انفاق کا مطالبہ کیا گیا ہے، وہ اس مال سے متعلق ہے جو اس کے پاس زائد از ضرورت ہے۔ اسلام کا یہ نقطہ نظر اشتراکیت کے اس نقطۂ نظر کے برعکس ہے جس کے مطابق شخصی ملکیت کی نفی کی جاتی ہے اور اسے اجتماعی تحویل میں دے کر فرد کو ایسی پوزیشن میں رکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے بجائے ریاست سے ان کی وصولی کا محتاج اور دست نگر ہو۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ جائز ضروریات کا تعین کیسے کیا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ اموال کی مادی مقادیر کے اعتبار سے ایسا تعین قطعاً محال ہے۔ اسی لیے اسلام نے کچھ کونی اصول بیان کر کے اور مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کر کے انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورت کو خود ہی متعین کرے۔ جن لوگوں نے اس کے برخلاف افراد کی ضروریات کی قانونی حد بندی کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اپنی کوششوں میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

باقی رہا آپ کا یہ خیال کہ زائد از ضرورت خرچ کر دینے کے بعد کچھ باقی نہ بچے گا اور سرمایے کا عامل پیدائش ختم ہو جائے گا تو یہ دو وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں۔ اولاً اس آیت کا لازمی اور قانونی منشا یہ نہیں ہے کہ زائد از ضرورت سارے کا سارا خرچ کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو صدقہ، زکوٰۃ اور وراثت وغیرہ سے متعلق بہت سے احکام کا نزول غیر ضروری ہوتا۔ ثانیاً اگر اس آیت سے یہ استنباط کیا بھی جائے کہ ضرورت سے زائد کا انفاق لازم ہے تب بھی راہِ خدا میں دینے کے ساتھ ساتھ ایک شخص اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے اگر کچھ پس انداز کرے تو یہ اس کی ایک ضرورت ہے جس سے اسے جبراً محروم نہیں کیا جا سکتا۔

زکوٰۃ کے متعلق آپ نے اپنے استاد صاحب کے جو اعتراضات نقل کیے ہیں وہ چند در چند غلط فہمیوں اور لاعلمیوں پر مبنی ہیں۔ پہلی غلطی معاشیات کے ان اساتذہ و ماہرین کی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ محض

ایک مالیاتی ٹیکس ہے جسے حکومت زبردستی وصول کرتی ہے اور دینے والا اسے دل پر پتھر رکھ کر دیتا ہے۔ حالانکہ زکوٰۃ اسلام میں نماز کی طرح ایک عبادت ہے جس کے اندر کام کرنے والی روح اور اس پر ابھارنے والا جذبہ ٹیکس سے بالکل مختلف ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ ہمارے ہاں صدیوں سے زکوٰۃ وصول کرنے والی اسلامی حکومت موجود نہیں، لیکن دینے والے ہم سے آ آکر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ ہمارے ذمے کتنی زکوٰۃ ہے کہ ہم اسے ادا کر کے اس فریضے سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس لیے زکوٰۃ کو ٹیکس کے مشابہ قرار دے کر اس کا ٹیکس کے قواعد و نظریات سے موازنہ کرنا بنیادی طور پر صحیح نہیں۔

• زکوٰۃ کو ٹیکس سمجھ لینے سے جو دوسری غلطی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ معاشیین اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ٹیکس کا فائدہ بالعموم امیروں اور غریبوں سب کو بلا امتیاز پہنچتا ہے کیونکہ وہ قومی خزانے کا جزبن جاتا ہے اور بعض صورتوں میں امیر اس سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں، لیکن زکوٰۃ ایک ایسا مال ہے جو لیا تو امیر اور متوسط طبقے سے جاتا ہے مگر اس کا استفادہ محض غربا کے لیے مختص ہے۔ یہ صرف نقد سرمایے پر نہیں، بلکہ اموال تجارت پر بھی ہے، زرعی پیداوار پر بھی ہے، مواشی پر بھی ہے، معدنیات اور زیورات پر بھی ہے۔ اس کی شرح ہر حال میں ڈھائی فیصد نہیں بلکہ کہیں دس فیصد اور کہیں اس سے زائد ہے۔ زکوٰۃ کا بڑا وسیع اور متنوع نظام ہے جس کا عمل یک طرفہ ہے اور جس میں **متزائد ٹیکس** کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی اگر یہ عمل لگاتار جاری رہے تو نظام معیشت بہت جلد خود بخود متوازن ہو جاتا ہے۔

آپ کے استاد صاحب کا یہ اعتراض بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ زکوٰۃ چونکہ آمدنی کے بجائے بچت پر ہے اس لیے ایک شخص بے دردی سے اپنی دولت کو خرچ کر کے اس سے بچ سکتا ہے۔ اس اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ زکوٰۃ ہر حالت میں بچت پر نہیں ہے۔ سال گزرنے کی شرط تو صرف نقد سرمایے یا سونے چاندی کے معاملے میں ہے، زرعی پیداوار پر زکوٰۃ فوراً عائد ہو جاتی ہے، اور ہمارے زرعی ملک میں یہ آمد زکوٰۃ کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح محض بچت پر زکوٰۃ والا اعتراض اموال تجارت، مصنوعات اور ان سے ملتے جلتے دوسرے کاروبار کے خلاف بھی مشکل ہی سے عائد ہو سکتا ہے، کیونکہ کوئی تاجر یا کاروباری اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ محض زکوٰۃ سے بچنے کی خاطر اپنے اموال سال گزرنے سے پہلے اونے پونے داموں پر بیچ دے

اور سرمایے کو بھی ٹھکانے لگا کر خالی ہاتھ بیٹھ رہے۔

لیکن اس طرح کے اعتراضات کی تہ میں جو بنیادی غلطی کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ معترض حضرات زکوٰۃ کے مجرد اصول کو اسلام کے اجتماعی نظریۂ حیات سے کاٹ کر اسے اپنی توجہ اور عنایت کا مرکز بنا لیتے ہیں اور یہ تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ زکوٰۃ کو اسلام کے پورے معاشی نظام میں اور پھر اس معاشی نظام کو اسلام کے پورے اجتماعی نظام کے فریم میں رکھ کر دیکھیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ستون خواہ اپنی جگہ کتنا ہی مستحکم و مزین کیوں نہ ہو اگر وہ بغیر کسی چھت اور عمارت کے فضا میں استادہ نظر آتا ہو تو وہ عجیب اور بے ہنگم معلوم ہوگا۔ بالکل ایسا ہی معاملہ زکوٰۃ اور اس کے خلاف اعتراضات کا ہے۔ لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ زکوٰۃ اگر آمدنی کے بجائے بچت پر لگائی جائے گی تو لوگ سارا روپیہ عیاشیوں پر خرچ کر ڈالیں گے۔ سوال یہ ہے کہ بالفرض محض ڈھائی فیصد زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ایک شخص اپنا سارا روپیہ لٹا دے گا تو آخر کس چیز پر لٹا دے گا؟ زنا کاری، شراب نوشی، رقص و سرود، جوا بازی، ریشم پوشی، سودی سرمایہ کاری، سٹہ، یہ سب اس کے لیے ممنوع ہیں۔ اسی طرح غیر پیدا آور (UNPRODUCTIVE) اور مفسدہ انگیز مشاغل کی راہیں قریب قریب مسدود ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ اسراف و تبذیر کی راہ میں بالواسطہ طریق پر رکاوٹیں عائد کر دے مثلاً خاص قسم کے سامانِ تعیش کی پیدائش اور درآمد کو روک دے۔ انسان اپنا پیسہ زیادہ تر انہی لذات و شہوات ہی میں کھپاتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ کچھ کرے گا، مثلاً مکان بنائے گا، یا فرنیچر خریدے گا تو روپیہ کسی نہ کسی صورت سے گردش میں تو آئے گا، اس کے عوض میں کوئی شے وجود میں تو آئے گی۔ اس سے کچھ لوگوں کو روزگار تو مہیا ہوگا اور روپیہ روک کر رکھنے کی بہ نسبت یہ بہرحال ایک بہتر صورت ہوگی۔ اسلام جو سرمایہ کے خرچ کرنے (SPENDING) کے بجائے اسے جمع کرنے (HOARDING) پر زکوٰۃ عائد کرتا ہے، اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کو جمع کرنے کے بجائے جائز طریق پر خرچ کرنے کی عادت پڑے، اور دولت رکنے اور منجمد ہونے کے بجائے حرکت میں آئے اور نمو پذیر ہو۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارۃً عرض کیا گیا اسلام محض معاشی قوانین و ضوابط ہی کی حد تک ہماری رہنمائی نہیں کرتا ہے، اسلام کا معاشی نظام، پورے اسلامی نظام کا ایک جزو ہے جس میں بہت سے اخلاقی، معاشرتی

اور سیاسی عوامل مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ان فی المال حق سوی الزکوٰۃ (یقیناً مال میں اللہ اور اس کے بندوں کا زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے)۔ وہ ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ اصل کمائی وہ ہے جو ہم نے راہِ خدا میں صرف کی، وہ نہیں جو ہم نے بچا کر رکھی، وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سُود کھانے سے نہیں بلکہ صدقہ دینے سے مال بڑھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حقوقِ واجبہ سے زائد کسی مالدار سے زبردستی مال تو وصول نہیں کیا لیکن اس نے ایسے مالدار پیدا کیے جنہوں نے اپنا سارا مال فی سبیل اللہ لٹا دیا اور ایسا بھی ہوا کہ سب کچھ دے دینے کے بعد اگر کوئی محتاج نظر آیا تو قرض اٹھا کر اس کی ضرورت پوری کر دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی محرکات کا انسان کے دوسرے اجتماعی اور اخلاقی محرکات سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ جب تک انسان کے انفرادی اخلاق کو درست نہ کیا جائے اور اس کے گرد و پیش کے اجتماعی ماحول کو ایک خاص ظاہری و معنوی سانچے میں نہ ڈھال دیا جائے انسان کا کوئی ایک مسئلہ الگ سے حل نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ معاشی مسئلہ ہو یا زندگی کا کوئی دوسرا مسئلہ۔

عائلی قوانین اور تفویضِ طلاق

سوال:۔ سائل کی شادی یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو نئے عائلی قوانین کی رُو سے یونین کونسل کے فارموں پر ہوئی۔ نکاح شرعی طریقہ پر ہوا۔ سائل کے سسرال اور ہمارے تعلقات بہت گہرے تھے اور بہت قریبی رشتہ داری تھی۔ نئے فارم کے چار پرت ہوتے ہیں نکاح کے وقت، کوئی شرائط درج نہیں کی گئی تھیں، ماسوائے حق مہر غیر مؤجل کے۔ چونکہ جلدی واپسی تھی اس لیے اس وقت یہ فیصلہ ہوا کہ دولہا اور دلہن اور اُن کے گواہان دستخط کر دیں کاغذ بعد میں مکمل ہوں گے اور بھیج دیے جائیں گے۔ نکاح کے وقت لڑکے سے طلاق دینے کا کوئی حق نہیں لیا گیا تھا اور نہ ہی پوچھا گیا تھا اور نہ ہی لڑکے نے اجازت دی تھی۔ نئے فارم کے کالم نمبر ۱۸ میں یہ عبارت درج ہے:۔

"آیا شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے اور کن شرائط کے تحت۔"

واضح رہے کہ اس وقت پر تب پُر نہیں کیے گئے تھے جبکہ نکاح ہوا تھا) بعد میں کاغذوں میں یہ عبارت درج ہو گئی "شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے۔" مگر ان میں وہ شرائط درج نہیں تھیں جن کی بنا پر لڑکی کو طلاق دینے کا حق تفویض ہوتا جیسا کہ فارم میں درج ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ فارم مجھے واپس میرے سسرال کی طرف سے پہنچ گئے۔ لیکن ہم نے انہیں شک نہ ہونے کی بنا پر نہیں پڑھا تھا بلکہ بے پروائی سے لپیٹ کر رکھ دیا۔

شادی کے دس ماہ بعد گھریلو تنازعات کی بنا پر دلہن اپنے میکے چلی گئی جہاں پر دلہن کے والدین نے دلہن کی طرف سے یونین کونسل میں طلاق کی درخواست دے دی اور یونین کونسل نے تین ماہ بعد بغیر کارروائی مکمل ہوئے یک طرفہ طلاق کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

دولہا نے قطعاً طلاق نہیں دی، اور نہ ہی دینا چاہتا ہے۔ اور نہ ہی لڑکے کو طلاق کا سرٹیفکیٹ، کونسل کی طرف سے ملا ہے۔ اب لڑکا اور لڑکی اپنا گھر بسانا چاہتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے والدین اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ یونین کونسل کی طرف سے جو سرٹیفکیٹ ملا ہے وہ شرعی طلاق ہے۔ اب آپ مندرجہ بالا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بتائیں کہ واقعی طلاق شریعت کی رُو سے ہو چکی ہے یا نہیں؟

جواب: مستفسر کا بیان یہ ہے کہ نکاح کے وقت اس نے حق طلاق بیوی کو تفویض نہیں کیا تھا لیکن اس کے علم و اطلاع کے بغیر یہ بات نکاح کے فارموں میں درج کر دی گئی کہ "شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے۔" اگر یہ بیان صحیح ہے تو عنداللہ بیوی کی جانب طلاق کا حق منتقل نہیں ہوا اور وہ اس حق کو استعمال نہیں کر سکتی۔ اگر محض کاغذی اندراج اور یونین کونسل کی کارروائی کے بل پر وہ طلاق کو ثابت کرنا چاہتی ہے تو خدا کے ہاں وہ عورت اور اس کے اولیا بھی مجرم ہیں، نیز وہ لوگ بھی سخت گناہ گار ہیں جنھوں نے ایک فارمولے کے طور پر بلا تکلف ہر نکاح نامے میں ایسے امور و مسائل درج کر دیے ہیں جن کے شرعی اور فقہی پہلوؤں پر بالعموم نکاح کے فریقین، بلکہ نکاح خوان بھی اچھی طرح حاوی نہیں ہوتے اور اس بات

کا ہر وقت خدشہ موجود رہتا ہے کہ ان فارموں کو پُر کرنے والا شخص جس طرح چاہے انہیں پُر کر کے زوجین سے دستخط یا نشان انگشت ثبت کرالے، درآنحالیکہ زوجین کو اس بات کا علم و احساس تک نہ ہو کہ آیا وہ مجرد ایجاب و قبول کے علاوہ کچھ مزید قیود و شروط بھی تسلیم کر رہے ہیں یا نہیں، اور اگر کر رہے ہیں تو اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے؟

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تفویض طلاق سے متعلق سوال کا جواب شوہر کی موجودگی میں اور اس کی اجازت سے لکھا گیا ہے، تب بھی یہ جواب بالکل ناقص اور ادھورا ہے۔ نکاح نامے کا سوال یہ ہے:-

"آیا شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے اور کن شرائط کے تحت"۔

اس سوال کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ یوں ہے:-

شوہر نے بیوی کو طلاق دینے کا حق تفویض کر دیا ہے"۔

جس شخص نے بھی یہ جواب تحریر کیا ہے اس کی یہ ناگزیر ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات کی تصریح پہلے شوہر سے کراتا اور پھر جواب میں بھی یہ توضیح کرتا کہ حق تفویض کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط ہے یا غیر مشروط ہے اور جس طلاق کا حق دیا جا رہا ہے وہ رجعی ہے یا بائن ہے، ایک ہے یا دو ہیں یا تین ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے بھی جواب میں اس پہلو کی صراحت ضروری تھی اور مطلوبہ فارم کے سوال کا آخری حصہ بھی اس تصریح کا مقتضی تھا۔ اس کے باوجود جواب میں ان چیزوں کی عدم تصریح سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ فارم پُر کرنے والا شخص نکاح و طلاق کے مسائل سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے ایک مبہم اور غیر مکمل جواب لکھ دیا ہے جس سے شوہر کے اس الزام کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ عبارت جعلی ہے جو اس کے علم میں لائے بغیر درج کر دی گئی ہے۔

تفویض طلاق کے معاملے میں صحابہ و تابعین کی ایک بڑی تعداد اور امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور متعدد دیگر فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اگر مرد نکاح کے وقت کسی مدت یا وقت کا تعین کیے بغیر تفویض کرے تو حق کو عورت صرف اسی مجلسِ نکاح میں استعمال کر سکتی ہے۔ اگر عورت کسی دوسرے کام میں مشغول

ہو جائے یا خاموش ہو کر مجلس سے اُٹھ جائے تو اختیار باطل ہو جائے گا۔ البتہ خاوند اگر تفویض کے وقت یہ اختیار دے کہ اس کی بیوی جب چاہے یا جس وقت چاہے، اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے، تب یہ حق غیر محدود ہے۔ اور عورت اسے ہمیشہ استعمال کر سکتی ہے۔

تفویض طلاق کا حق استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عورت صاف الفاظ میں اپنے آپ کو طلاق دے۔ محض کونسلوں کے سرٹیفکیٹ اس معاملے میں معتبر نہیں ہیں۔ طلاق کی تعداد کا تعین کیے بغیر خاوند نے عام الفاظ میں تفویض طلاق کی ہو تو اس صورت میں عورت اگر اپنے آپ کو ایک یا دو طلاق دے گی یا تعداد کا ذکر نہیں کرے گی تو یہ طلاق عدت کے اندر رجعی ہوگی جس کے بعد رجوع جائز ہوگا اور عدت کے بعد ایسی طلاق بائن یا مغلظہ ہوگی جس کے بعد نکاح ثانی جائز ہوگا۔ لیکن عورت نے اگر اپنے اوپر تین طلاق وارد کر لی ہیں تو پھر طلاق کے مغلظہ ہونے کا انحصار خاوند کی نیت پر ہے۔ اگر تفویض طلاق کے وقت خاوند کی نیت تین طلاق کی تھی، تو طلاق مغلظہ ہو جائے گی، ورنہ نہیں ہوگی۔

تفویض کے معاملہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ حق اگر انعقاد نکاح سے قبل دیا جائے تو غیر معتبر ہے۔ اس حق کے موثر اور صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خاوند کی طرف سے دوران ایجاب قبول یا نکاح ہو جانے کے بعد دیا جائے یا کم از کم حق دیتے وقت نکاح کی جانب نسبت و اضافت ہو۔ مثلاً خاوند یہ کہے کہ فلاں عورت سے میرا نکاح ہو جانے کی صورت میں اسے حق طلاق حاصل ہوگا۔

حق تفویض کے معاملہ میں اور بھی بہت سی تفصیلات ہیں، جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ اصولاً اتنی بات یہاں واضح کر دینا مناسب ہے کہ از روئے قرآن طلاق کا حق اصلاً مرد کو دیا گیا ہے، نہ کہ عورت کو (بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ)۔ جب اس حق کو عورت کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نکاح ناموں میں ایسے سوالات پہلے سے چھاپ کر ہر کس و ناکس کو یہ دعوت دی جاتی ہے اور سکھایا جاتا ہے کہ وہ شریعت کی قائم کردہ تقدیم و ترتیب کو الٹ دیں اور طلاق کا اختیار مرد سے چھین کر عورت یا کسی کونسل کے ہاتھ میں دے دیں تو اس کے نتیجے میں اتنی قباحتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا پیشگی تصور بھی محال ہے۔ جن اربابِ اختیار نے ایسے قواعد وضع کیے ہیں اور وضع کرنے کے بعد ان کے نفاذ و انطباق کی ذمہ داری کا بوجھ نااہل کندھوں پر ڈال دیا ہے، کاش کہ وہ اس صورت حال پر غور فرمائیں اور اس کا تدارک کریں۔